

اشارات

جماعت اسلامی کی "سیاسی سرگرمیاں" اس کے مخالفین کے لیے تو خیر تکلیف کی باعث ہیں ہی مگر ان پر بعض اوقات وہ حضرات بھی تشویش کا اظہار کرتے گئے ہیں جن کا عام طرز عمل جماعت اور اس کے محترم امیر کے ساتھ برا بھلا نہ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں جب جماعت "سیاسی سرگرمیوں میں ذرا زیادہ انجمن گئی" تو بہت سے "بہی خواہوں" کی زبان اور قلم سے اس قسم کے ٹیڈے نکلے "جماعت اسلامی ایک دینی جماعت ہے سیاست میں دخل جو کہ اس نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو گندگی میں ٹوٹ کر لیا ہے۔" تمونا نامو دوری کو اللہ تعالیٰ نے اچھی دینی بصیرت عطا کی ہے وہ قلم کے زور سے دین کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں ایسے دین سیاست میں ٹر کر بلاوجہ اپنی سلاستیں نثار کر رہے ہیں۔ اس قسم کے جملے الفاظ کے تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ بار بار سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں۔ خصوصاً جب سیاسی زندگی میں مچل پیدا ہوتی ہے اور جماعت کو اس میدان میں ذرا زیادہ سرگرمی دکھانی پڑتی ہے تو جماعت کے بعض خیر خواہ ان تاثرات کو زیادہ شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور بااوقات خود ذوقاً جماعت سے مل کر انہیں اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ جماعت اور اس کے امیر کو اس گندگی سے بچانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔

ان حضرات کے غلو سے اور جذبہ صادق کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں مگر ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ۳۰ سال سے جو جماعت تحریر و تقریر اور اپنے عملی کام کے ذریعہ سے مسلسل اپنے موقف کو واضح کر رہی ہے اس کے اسل مفہم اور اس کے کام کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں ان کو آخر اتنی زحمت کیوں پیش آ رہی ہے۔ ان تاثرات کو اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ جماعت اسلامی صرف سیاسی کام ہی نہیں کر رہی ہے بلکہ

یہ اس کے دائرہ کار کا صرف ایک حصہ ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مسندِ اقتدار کا حصول ہماری جدوجہد کا مقصد کبھی نہیں رہا ہے۔ اگر یہ ہمارا مقصد ہوتا تو ہمارے زنگ و سنگ کچھ اور ہوتے۔ ہم نے بار بار اس امر کا اعلان کیا ہے کہ اس ملک کا جو صاحب اختیار بھی خلوس نیت کے ساتھ یہاں واقعی اسلامی نظام کے قیام کے لیے کام کرے ہم اس کی رتاب تمام کر چلنے کو اپنے لیے باعثِ سعادت خیال کریں گے۔ پھر ہمیں کوئی دماغی مرض بھی لاحق نہیں ہے کہ ہم خود اپنے دشمن بن گئے ہوں اور طرح طرح کے مخالفین سے خواہ مخواہ گالیاں کمانے اور اقتدار کے ہاتھوں بلاوجہ ظلم و ستم سہنے میں ہمیں کوئی لذت محسوس ہوتی ہو۔ جب ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے تو پھر ہمارے کرم فرماؤں کو اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ آخر وہ کیا خاص ضرورت ہے جس کی خاطر قیامِ پاکستان کے بعد سے ہم مسلسل اس ملک کے سیاسی خازن میں کام زن ہو کر اپنے لیے ہر طرح کی پریشانیاں مول سے رہے ہیں؟ اگرچہ ہماری طرف سے اس کی وساحت میں کبھی کوتاہی نہیں ہوتی ہے، لیکن ایک مرتبہ پھر ہم اس سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ اس سے ہماری دعوت کی نوعیت ہماری تحریک کا مقصد، منہاج اور ہماری سیاسی معاشرتی، مذہبی سرگرمیوں کی صحیح سورت انشاء اللہ سامنے آجائے گی اور جو لوگ ہمارے کام کو خلوس نیت کے ساتھ سمجھنے کے خواہشمند ہیں ان کی بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

جس دعوت کو جماعت اسلامی بفضلِ ایزدی لے کر اٹھی ہے وہ صرف اسلام کی دعوت ہے اور جس نوعیت کے کام وہ کر رہی ہے وہ فی الحقیقت دینِ حق کے تقاضے ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ اسلام زندگی کے بارے میں کیا تصور پیش کرتا ہے۔ جو لوگ مختلف مذاہب پر نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ عام طور پر مذہب کا مقصد یہ سمجھا جاتا ہے کہ انسانی رُوح کو لامحدود ذات سے بکنار چھوڑنا نصیب ہو جائے اور اس طرح ایک قطارِ بحر بکیراں میں گم ہو کر اس کی غیر معمولی قوت اور وسعت سے لطف اندوز ہو سکے۔ یہ مقصد اسی سورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب رُوح جسم کی کثافتوں سے آزاد ہو جائے۔ اس نظریہ زندگی کے مطابق رُوح جسم کی دشمن ہے اور ہم رُوح کا دشمن

اور دونوں ایک دوسرے کو یک پہچانے کو ہی اپنی کامیابی خیال کرتے ہیں۔ کٹھن جسم کٹھن رُوح کی پرواز میں حائل ہونا ہے اور اس بات کی برابر کوشش کرتا ہے کہ اس کی کثافتیں رُوح کو بھی کثیف بنا کر اس سے قوت پرواز سلب کر لیں۔ اسی طرح رُوح بھی برابر اس کوشش میں لگی رہتی ہے کہ جسم کے بندھن منسوخ ہونے کے بجائے تازہ رُوح اور رُوح جلد از جلد ان سے رہائی حاصل کرے۔ چنانچہ رُوح جسم کو قوت توڑنا ہی بہم پہنچانے کے بجائے اسے کمزور اور مستعمل کرنے کی فکر کرتی ہے اور جسم اپنی کثافتوں سے رُوح کو بوجھل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

جسم اور رُوح کے درمیان اس حریفانہ تعلق نے زندگی کے پورے ڈھانچہ کو متاثر کیا ہے۔ اس تصور کے تحت صحیح معنوں میں مذہبی اور روحانی آدمی وہ ہوتا ہے جو دنیوی علاقے سے یکسر بے تعلق ہو کر اپنا زیادہ سے زیادہ وقت گیان و حیاں، مراقبہ و مکاشفہ اور مجاہدہ و ریاضت میں صرف کرے اور دنیا اور اس کے معاملات سے کسی طور پر بھی تعرض نہ کرے۔ جس نسبت سے کوئی انسان دنیوی معاملات اور تعلقات سے دامن بچا کر نفس کشی میں مشغول رہے اسی تناسب سے اسے روحانیت کی دولت سے مالا مال سمجھا جاتا ہے اور جس قدر اس کے اندر امور دنیا سے دلچسپی ہو اسی نسبت سے اسے روحانیت کی نعمت سے محروم تصور کیا جاتا ہے۔

اس بنیاد پر زندگی کی تنزیہ کا تصور قائم ہوا اور روحانی زندگی کے شدید ایسوں نے مادی زندگی سے یکسر منہ موڑ کر اپنی توجہ روحانی کیفیت وستی کے حصول میں صرف کرنے کی کوشش کی۔ وہ جہاں بھی رہے اپنے ملک کے معاشرتی ڈھانچے اس کی سیاسی ہیئت، اس کی معاشی تنظیم اور اس کے اجتماعی مسائل سے بے تعلق رہے تھے کہ خود اپنے جسم کے تقاضوں سے بھی انہیں نفرت ہی رہی۔ ان کے ذہن میں یہ بات پوری طرح راسخ ہو گئی کہ زندگی کے یہ سارے دائرے نجس اور ناپاک ہیں اور وہ ان سے جس قدر دور رہیں گے اسی قدر وہ رُوح کی پاکیزگی کے لیے زیادہ سامان فراہم کر سکیں گے۔ اس بنا پر مذہبی لوگوں نے اپنے دامن کو دنیوی معاملات سے ہمیشہ بچانے

کی نمک کی اور دنیا کا سارا کام رو بارن لوگوں کے ہاتھ میں رہا جو مذہب اور اس کی اعلیٰ قدر یا روحانیت کے طبیعت
اسات سے نہ صرف کبیر خود سمجھتے۔ بلکہ انہیں خود اپنے بارے میں روحانی و اخلاقی احساس سے ہی دست
بوسنے کا پوری طرح اعتراف تھا۔ ان کے سمجھنے میں یہ بات اچھی عریٰ چہی مہی تھی کہ وہ شیطان میں اور دنیا کے
معاملات چلانے کا جو کام وہ کر رہے ہیں وہ تبدیلی کا کام ہے اور شیطان کی طرف سے ان سے چاہا یا جانا چاہیے قیام
عدل اور ان کے حق کے کام سے جب نیک اور انہیں لوگ دست بردور ہو جائیں تو چور اچکے اس مسند
کو خالی یا کہ مجرمانہ ذہنیت کے ساتھ اس پر برا بھلا ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں میزان عدل کا جیسا کچھ متحر
ہو سکتا ہے وہی انسان کی اجتماعی زندگی کا بوجھ ہے۔ مذہب کے اسی تصور کے تحت مذہب کے نیک اور پاک باز
بندوں نے منکوں اور ویرانوں کا رخ کیا اور وہاں مراقبہ کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش
کی اور اجتماعی زندگی کی عنان خود بخود ان لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دی جو نیکی اور شرافت سے بائٹل عادی تھے۔

ان دو گروہوں کے درمیان ایک تیسرے ایسے گروہ نے بھی جنم لیا جو اپنی ذات میں ان دونوں کی
خصوصیات جمع کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایک طرف تو معرفت الہی کے تیسری عنصر سے محروم ہونا گوارا نہ تھا مگر
دوسری طرف جسم کی لذتوں اور دنیا کی دلچسپیوں اور دنیوی معاملات چلانے کی ذمہ داریوں کو تیاگ دینے
پر بھی وہ راضی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن دنیا جن مذہب سے آشنا تھی ان میں اس بیچ کے طرز عمل کے لیے کوئی
روحانی موجود نہ تھی اور ان کے پیشواؤں نے اس کے لیے کوئی عملی نمونہ بھی نہ چھوڑا تھا۔ اس لیے اس تیسرے
گروہ نے ایک ہی شخصیت کے اندر دو متضاد انسان پائے شروع کیے۔ ایک وہ انسان جو روحانی کیفیت
مستی کا آرزو مند ہو اور اس کے حصول کے لیے مذہب کے ساتھ تعلق خاطر پیدا کرنے۔ اور دوسرا وہ
انسان جو دنیوی امور کو خالص مادہ پرستانہ نقطہ نظر سے دیکھے اور اس کے مطابق انہیں طے کرے اور زندگی
کے دنیوی دائرے میں کسی اخلاقی یا روحانی احساس کو اثر انداز نہ ہونے دے۔ چنانچہ ان مذہب کے پیرو
میں اس تضاد کی مظہر تعدادِ شخصیتیں ابھر کر سامنے آئیں اور انہوں نے مذہب کی اثر آفرینی کے دائرے کو پہلا
تک محدود کر کے رکھ دیا کہ چند مذہبی رسوم کی بجا آوری کے سوا مذہب کا کوئی نشان دنیوی معاملات میں باقی

نہ رہا۔ انسان کی اجتماعی زندگی مذہب اور اس کے اثرات سے یکسر بیگانہ ہو گئی۔ اگر کبھی مذہبی آدمی نے اجتماعی معاملات میں دخل دینے کی کوشش کی تو لوگوں کے مذہبی احساسات بے سخت دھچکا لگا اور انہوں نے یہ جو کہ اس کی راہ روکنے کی کوشش کی کہ ایک پاکیزہ رُوح انسان خواہ مخواہ اپنے آپ کو شیطانِ کاموں میں الجھا رہا ہے۔ پھر بھی اگر وہ باز نہ آیا تو اس کے بارے میں باور کر لیا گیا کہ یہ شخص مذہب کے مقدس نام پر دنیا کا ناپائیدار ہے اس لیے بے سخت نفرت و حقارت کا مستحق ہے۔ ان مذہبی تصورات کے لحاظ سے شاید اس سے بڑھ کر ناقابلِ معافی گناہ کوئی نہیں رہا ہے کہ ایک دیندار آدمی عالمِ بالا سے لو لگانے کے بجائے دنیا کے معاملات نمٹانے میں لگ جاتے

انسانی زندگی کے بارے میں یہ سارے نظریات مذہب کے اس اساسی تصور کے شاخسانے ہیں جس کے مطابق رُوح اور جسم کا تعلق طائر اور قفس کا ہے۔ اسلام اس تصور کو بنیادی طور پر غلط سمجھتا ہے اور یہ دعویٰ پیش کرتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان تعلق کی بنیاد عداوت اور مخالفت نہیں بلکہ تعاون اور حمایت کی ہے۔ رُوح اپنی بالیدگی کے لیے جسم کی محتاج ہے اور جسم اپنی طہارت کے لیے رُوح کی پاکیزگی کا رہبر منت ہے۔ اس بنا پر صحیح فہم کا مذہبی احساس پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ رُوح اور جسم ایک دوسرے کو اپنا دشمن اور حریف سمجھنے کے بجائے ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہوں۔

فلسفہ مذہب کے ایک نامور مصنف نے اپنی علامۃ تصنیف "عبادت" میں مذہب کے بارے میں ان دونوں تصورات کے مابین فرق کے اصل وجوہ بھی بیان کیے ہیں۔ اس کا تجزیہ یہ ہے کہ مذہب کے پیدے تصور کے مطابق، جو جسم اور رُوح کی باہمی دشمنی سے عبادت ہے، روحانیت کی معراج یہ ہے کہ رُوح سے مادّی علّاق سے اپنے آپ کو منقطع کر کے خالق اور مالک سے ہم آہنگ ہو جائے۔ اس کے برعکس دین کا دوسرا تصور جس کی رُوح اور جسم ایک دوسرے کے معاون ہیں، بندگی رب کے نظر پر قائم ہے۔ اس نقطہ نظر سے مذہب کا تمہائے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے خالق اور مالک کا انتہائی فریادار بندہ بن کر رہے اور ان ساری ذمہ داریوں سے اس کے حکم کے مطابق عہدہ برآ ہونے کی

کو شش کرے جو خالق کی طرف سے اس پر بحیثیت بندے کے عائد ہوتی ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق روحانی ترقی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسانی روح خالق میں گھو جاتے کیونکہ اگر بندے اور رب کے درمیان امتیاز باقی نہ رہے تو پھر بندہ بندگی رب کے تقاضوں کو کس طرح پورا کر سکتا ہے۔ وہ مالک الملک کا اسی صورت میں بندہ بن کر رہ سکتا ہے جب اس کے اندر اس امر کا پُوری طرح احساس باقی رہے کہ وہ خالق و مالک کا محض ایک بندہ ہے۔ مذہب کے اس تصور کے مطابق معرفت الہی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کا شعور بھی انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ اس عرفان کے بغیر خدا اور بندے کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔

مذہب کے متعلق ان دونوں نظریات کے درمیان جو اساسی فرق ہے اگر اسے سمجھ لیا جائے تو پھر اسلام کی دعوت اور اس دعوت کی روشنی میں جماعت اسلامی کے موقف اور طریق کار اور ملک کی سیاست سے اس کی دلچسپی کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا۔ جب ایک انسان مذہب کے اس تصور کو قبول کر کے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے کہ اس کا اپنے خدا کے ساتھ تعلق و راصل اطاعت اور بندگی کا تعلق ہے تو پھر اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف اپنی روح کو خداوند تعالیٰ کی اطاعت پر آمادہ نہ کرے بلکہ اپنے جسم کو بھی خالق و مالک کی فرمانبرداری کی تربیت دے۔ کیونکہ انسان رُوح اور جسم دونوں کے ارتباط کا نام ہے۔ اگر انسانی رُوح خدا کی اطاعت کی طرف مائل ہو مگر جسم اس کا ساتھ دینے پر تیار نہ ہو تو بندگی رب کے تقاضے پورے نہیں ہوتے اس لیے کہ روح جسم کے بغیر کوئی اہمیت نہیں رکھتی اور جسم رُوح سے الگ ہو کر کسی کام کا نہیں رہتا۔ اسلام رُوح کو نفسِ عنصری کا قیدی سمجھ کر اسے آزاد کرانے کی دعوت نہیں دیتا بلکہ جسم کا معائنہ سمجھ کر اسے بھی پاکیزہ بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اکیلی روح یا تنہا جسم دونوں میں سے ایک بھی ایک دوسرے سے بے تعلق ہو کر یا ایک دوسرے کے حریف اور دشمن بن کر بندگی رب کی ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے۔ اگر اسلام کا مقصد صرف روحانی کیفیت و مستی کا حصول ہوتا تو وہ یقیناً روح کو جسم کی کشتیوں سے محفوظ رکھنے پر زور دیتا اور اسے اس بات پر آمادہ کرتا کہ وہ اس نفس کی تیلیوں کو

زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن جو دین انسانی زندگی کا مقصد بندگی رب فرار دیتا ہے وہ نوح اور جسم دونوں کو خدا شناس بنانا پاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں رکھیے کہ ایمان اور عمل صالح کو ساتھ ساتھ رکھا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا خوفی کا جو احساس روح کے اندر پیدا ہوتا ہے اس کا اظہار انسانی عمل سے بھی ہو۔ اسی طرح نماز اور زکوٰۃ کی فرضیت کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نماز روح کی طہارت کا التزام ہے اور زکوٰۃ مادی دولت کی پاکیزگی کا سامان ہے۔

اسلام نے روح کے تزکیہ اور جسم کی طہارت دونوں کو بندگی رب کے لیے جس طرح ضروری سمجھا ہے اس کا اندازہ کتب حدیث کی اس ترتیب سے آسانی نکایا جاسکتا ہے جسے ان کی تدوین میں ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ حدیث کا قریب قریب ہر مجموعہ کتاب الایمان سے شروع ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے اللہ کی اطاعت اور بندگی کے لیے سب سے پہلی شرط روح کی پاکیزگی اور طہارت ہے۔ اس حصے میں خدا، آخرت، حشر و نشر، نبوت، ملائکہ سب کے بارے میں غلط تصورات کی تردید اور صحیح عقائد کی صراحت ملتی ہے تاکہ ایک بندہ مومن سب سے پہلے اپنی روح کی کثافتوں کو دور کر کے اسے اللہ کی بندگی جیسے مقدس فرض کے لیے آمادہ کرے۔ کتاب الایمان کے بعد فوراً کتاب الطہارت شروع ہوتی ہے جس کا مرکز و محور جسم کی پاکیزگی ہے۔ اس کے بعد کتاب الصلوٰۃ ہے جو پھر روح کی بالیدگی کے لیے سب سے پہلی عملی تربیت ہے۔ اور پھر کتاب الزکوٰۃ جو مال و دولت اور مادی وسائل یا دوسرے لفظوں میں امور دنیا یا مادی زندگی کے بارے میں روحانی احساس اور اخلاقی ذمہ داری پیدا کرنے کا لائحہ عمل ہے۔ قرآن مجید اور حدیث کی ان تفسیرات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اصل روحانیت مادی زندگی کے علاقے کو توڑنا نہیں بلکہ خود مادی علاقے میں روحانی لطافت پیدا کرنا ہے تاکہ روح اور جسم دونوں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار بن کر بندگی رب کے تقاضوں کو پورا کریں۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسانی روح تو معرفت الہی کے اونچے سے اونچے مقامات تک پرواز کرے تقریب باری تعالیٰ حاصل کرے اور جسم یا تو مادہ پرستی کی کثافتوں میں مٹوٹ رہے، یا پھر معرفت کا کوئی اثر جسم پر مترتب نہ ہو۔ اسلام روح اور جسم دونوں کا ایک

ساتھ تزکیہ کرنے کی تلقین کرتا ہے اور دونوں کو بارگاہِ الہی میں فائز المرام دیکھنا چاہتا ہے۔ دنیا کے سارے مذاہب میں اسلام کا سب سے بڑا امتیاز یہی ہے کہ اس نے زندگی کے اُس حصے کو جسے معرفتِ الہی کے شیدائی بالکل تاریک حصہ خیال کر کے اس کے نام سے بھی وحشت محسوس کرتے تھے، اس کے اندر عرفانِ ربانی کی قندیں روشن کر کے اسے روح کی طرح منور کر دیا۔ یہ امتیاز اسلام اور صرف اسلام کو حاصل ہے۔

روح اور جسم کی یکساں پاکیزگی کے اسی تصور پر اسلام نے انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی کو پاکیزہ بنانے کی دعوت دی ہے۔ اگر فرد کو بمنزلہ روح اور معاشرے کو جسم سمجھ لیا جائے تو اسلام کا پورا نظام حیات سمجھ میں آسکتا ہے۔ اسلام بنیادی طور پر تو ایک فرد کی اصلاح چاہتا ہے کیونکہ فرد ہی وہ اہلی ہے جس سے معاشرہ تعمیر ہوتا ہے۔ جیت تک فرد جو کسی معاشرے کے لیے روح کی حیثیت رکھتا ہے روحانی اور اخلاقی احساسات سے بہرہ مند نہیں ہوتا اس وقت تک کسی پاکیزہ اجتماعی زندگی کی بنیاد نہیں ڈالی جاسکتی۔ یہاں تک تو اسلام اور دوسرے مذاہب کسی نہ کسی حد تک ایک دوسرے کے ساتھ بیٹے ہیں لیکن اختلاف اور شدید اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ جس طرح روح کی پاکیزگی کے لیے جسم کی پاکیزگی ضروری ہے، کیونکہ اگر جسم ٹھیک طریق سے پاکیزہ نہ ہو تو روح کی لطافت مجروح ہوتی ہے، بالکل اسی طرح اسلام فرد کے روحانی نشوونما کے لیے یہ ناگزیر سمجھتا ہے کہ جس اجتماعی ماحول میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے اسے بھی گندگیوں سے پاک اور روحانی اور اخلاقی احساسات سے معمور کر دیا جائے تاکہ فرد کے ہر سانس کے ساتھ اس کے اندر نیکی اور شرافت سے لبریز ہوا داخل ہو جو اس کی نشوونما کے لیے تقویت کی باعث بنے جس طرح روح جسم کی کٹافتنوں سے بچھل ہوتی ہے، اور جسم کی پاکیزگی سے لطافت اخذ کرتی ہے بالکل اسی طرح ہر فرد اجتماعی ماحول سے اثرات قبول کرتا ہے۔ ماحول کی گندگیاں اُس کے افکار و نظریات اور اس کے اخلاق و عادات پر برابر اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ خواہش اور آرزو کے باوجود ان سے اپنے آپ کو بچا کر نہیں رکھ سکتا۔ اگر کوئی اجتماعی ماحول نیکی، خدا ترسی، فکر و نظر کی پاکیزگی سے معطر ہے تو جو فرد بھی اس میں زندگی بسر کر رہا ہو وہ لازمی طور پر اس روح افزا اور فرحت بخش نفاذ سے

اچھے اثرات قبول کرے گا۔ اسی طرح اگر کسی فرد کے ارد گرد کا ماحول، فحاشی، بے حیائی، لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم اور فسق و فجور سے بھرا ہوا ہو تو کوئی فرد تمنا اور آرزو کے باوجود اپنے دامن کو اس سے بچا کر نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ خود بُرائی کے ان کاموں سے مجتنب بھی رہے تو اس کا تعفن بہر طور اس کے دل و دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ گلاب کے پھول گندگی کے ڈھیروں میں نہیں چمکتے کیونکہ وہ فضا انہیں راس نہیں آتی۔ وہ اپنی بہا و طبیعت اور پاکیزہ فضا ہی میں دکھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام فرد کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے پاکیزہ اور سازگار ماحول پیدا کرنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ اسلام کا یہ اصول انسانی فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے۔ جس طرح کوئی صاف ستھرا ذوق رکھنے والا انسان کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کے سامنے غلاظت کے ڈھیر ٹپے رہیں اور ان سے اس کی طبیعت کے اندر کوئی کراہت نہ پیدا ہو، بالکل اسی طرح اسلامی روحانیت کا لذت آشنا ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ جس اجتماعی ماحول میں زندہ ہے اس میں برائی اور ظلم و ستم کا دور دورہ ہو اور اس کی روحانیت کو اس نشوونما کی صورت حال سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق روح کو کوئی ایسا ہوا بند گوشہ میسر نہیں آ سکتا جو ماحول کے اثرات سے یکسر مامون ہو۔ اس بنا پر روحانیت کی پاکیزگی کے لیے ضروری ہے کہ ماحول کو پاکیزہ بنانے کی فکر کی جائے۔

یہ سادہ سی حقیقت ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور یہی سیدھی سی بات ہے جسے جماعت اسلامی نے اپنی دعوت کی بنیاد بنایا ہے۔ یہ دعوت ہمارے اپنے ذہن کی احتراع نہیں۔ یہ کوئی بدعت نہیں جو جماعت اسلامی کے لوگوں نے خود اپنے دماغ سے گھڑ لی ہو۔ بلکہ یہ کائنات کی وہ سب سے بڑی حقیقت ہے جسے تمام انبیاء و علیہم السلام نے پیش کیا ہے اور جسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف انداز میں بیان فرمایا گیا ہے:

وہ اس کے سوا کسی بات پر مامور نہیں کیسے گئے کہ صرف ایک معبود کی بندگی کریں جس کے سوا کوئی عبارت کے لائق نہیں۔ وہ پاک ہے اس شرک سے جو وہ کر رہے ہیں۔

وَمَا أَسْرَفْنَا إِلَّا لِنَعْبُدُكَ يَا إِلَهًا وَاحِدًا
لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَكَ عَمَّا يُشْرِكُونَ
دسورہ توبہ: ۳۱

بندگی صرف نماز ادا کرنے اور روزے رکھنے کا نام نہیں بلکہ پوری زندگی کو اطاعتِ خداوندی میں گزارنے کا نام ہے۔ بندگی خدا کے بارے میں ایک خاص طرزِ فکر اور ایک مخصوص طرزِ عمل کی طالب ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جس ناتی و مالک کو اپنا معبود اور اذیت تسلیم کر رہا ہے اس کی فات، اس کی صفات اور اس کی باوثاقی اور حاکمیت میں کسی دوسرے کو فکر و عمل کے اعتبار سے شریک نہ ٹھیرائے۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن مجید نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ بندگی رب کے تقاضے پورے کرنے کے لیے صرف یہی بات ہی کافی نہیں کہ انسان خدا کا مطیع و فرمانبردار ہونے کا دعویٰ کرے۔

..... بلکہ یہ بات بھی ضروری ہے کہ وہ ہر اس عقیدے اور ہر اس تصور اور عمل سے اجتناب کرے جو خدا کی اطاعت اور بندگی کی ضد ہو۔ چنانچہ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ ج -
اور ہم نے ہر قوم میں ایک پیغمبر بھیجا اس دعوت اور پیغام کے ساتھ کہ اللہ کی بندگی کرو، اور ہر جھوٹے خدا کی عبادت اور بندگی سے بچو۔
(سورہ نحل: ۳۶)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم سارے باطل خداؤں سے کیسے منہ موڑ کر اپنے آپ کو خدا کے واحد کی غلامی میں دے دو اور زندگی کے کسی گوشے میں بھی کسی معبودِ باطل کی بندگی اختیار نہ کرو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں قرآن مجید نے نہایت واضح طور پر بندگی رب کا مفہوم متعین کر دیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ طَائِفَةٌ لَكُمْ وَعَدُوٌّ مُّبِينٌ - سورہ البقرہ: ۲۰۸
اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔

پھر ہی زندگی کو اسلام کے دائرے میں لے آنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ عقائد، عبادات، اخلاق، معاشرت، ثقافت، سیاست، معیشت، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کو اسلام کے حدود کا پابند بنا دیا جائے۔ اسی سے بندگی رب کے تقاضے پورے ہوتے ہیں کیونکہ اگر زندگی کا کوئی

گوشہ نبی اللہ کی اطاعت سے باہر اور غیر اللہ کا تابع رہ جاتے تو اس سے زندگی کے اندر وہ توحید قائم نہیں ہوتی جسے اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

جماعت اسلامی کی دعوت و حقیقت اَدْحُوْا فِي السَّلْمِ كَاَقْدَہ کی دعوت ہے اور اس کا لائحہ عمل اِعْبَادُوا اللّٰہَ کی وہی عملی تفسیر ہے جو انبیاءِ علیہم السلام اور صلحاءِ امت نے پیش کی ہے۔ اس کی دعوت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کی دعوت، آخرت کی جو ابدی کا خوف، حشر و نشر، الغرض دینی مقصدات پر نچتہ اور غیر منتر نزل یقین شامل ہے۔ اس کے پروگرام میں باطل افکار و نظریات کی تردید، صحیح عقائد کی تفسیر، نیک اور صالح اعمال کی ترغیب اور غیر اسلامی رجحانات اور افعال و اعمال کی اصلاح و اخل ہے۔ اس نے اپنی دعوت اور اپنے طریق کار کے تعارف کے لیے جو ٹیڑھ پھیر پیدا کیے اسے ایک نظریہ دیکھنے سے اس کے پیغام اور کام کی ہمہ گیری اور وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس ٹیڑھ میں باطل عقائد و نظریات اور لادینی رجحانات کی تردید بھی ملتی ہے۔ مغربی تہذیب کے اثر و نفوذ نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جو نئے نئے مسائل اور پیچیدگیاں پیدا کی ہیں ان کا صحیح تجزیہ اور پھر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل بھی ملتا ہے اور مسلمانوں کو از سر نو اسلام کی بنیاد پر اپنی زندگی اُستوار کرنے کے لیے عملی رہنمائی بھی حاصل ہوتی ہے۔ عقائد، عبادات، معیشت، معاشرت، سیاست، الغرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کے متعلق اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام جمع نہ کر دیئے گئے ہوں۔ انسانی زندگی جن افکار و احساسات سے عبارت ہے اور وہ جن گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے ان سب کے بارے میں جماعت اسلامی نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو موجودہ دور کے عملی تقاضے سامنے رکھ کر پیش کر دیا ہے تاکہ اس زمانے کا انسان اس زمانے کے حالات میں اسلام کی صحیح پیروی کر سکے۔ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں، اسلامی عبادات پر ایک نظر، رسالہ دینیات، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، خطبات، نتیجات، تعہدات، اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامی ریاست، الجہاد فی الاسلام۔ یہ ساری کتابیں اسلامی عقائد و اعمال کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں اور

جماعت اسلامی کا کوئی بڑے سے بڑا دشمن بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ ان کتابوں سے نہ صرف قلب و دماغ کی تلہیریں مدد دی ہے بلکہ ان کے اندر ایمان کی شمع بھی فروزاں کی ہے خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ نسل جسے مغربی انکار کا طوفان بڑی سرعت کے ساتھ بہا کر رہا ہے اسے اپنے بچاؤ کے لیے اس ٹریچر سے ہی کافی حد تک سہارا ملا ہے۔

یہ جماعت اسلامی کے کام اور اس کے وسیع پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ اس کا دوسرا حصہ مسلمانوں کو عملاً اللہ کی بندگی پر آمادہ کرنا اور طاعت سے ان کا رشتہ منقطع کر کے اسے خدائے واحد لا شریک کے ساتھ جوڑنا ہے، کیونکہ جب تک غیر اللہ کی غلامی سے کسی انسان کو نجات نہیں ملتی اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں خدائے واحد کی غلامی اختیار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں داخل ہوتے ہوئے جس عظیم حقیقت کا کسی انسان سے اعتراف کرایا جاتا ہے وہ یہی ہے کہ انسان سب سے پہلے اس امر کا احساس کرے کہ سچے خدا کے ساتھ دنیائے کچھ معبودانِ باطل بھی گھڑ رکھے ہیں جن کی عشقیت و محبت اور بندگی و اطاعت میں لوگ گرفتار ہوتے رہے ہیں اور مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان ان جھوٹے خداؤں کی نفی کر کے صرف ایک معبود حقیقی کو اپنا رب تسلیم کرے۔ اس بنا پر خدا کی محبت کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی اپنے قلب و دماغ کے سارے گوشوں میں سے غیر اللہ کی محبت مٹا دے۔ یہی چیز طاعت سے قطع تعلق ہے جس کے متعلق قرآن پاک میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا رَ الْبَقْرہ - ۶- ۲۵۔ جو طاعت سے کفر کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے ایک مضبوط سہارا تمام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ طاعت سے کفر اور اللہ پر ایمان لازم و ملزوم ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا اور طاعت دونوں سے آدمی کا رشتہ جڑا رہے اور پھر بھی وہ مسلمان ہو۔ طاعت صرف انسان کے دل و دماغ پر ہی مسلط ہو کر نہیں بیٹھا رہتا بلکہ وہ زندگی کے سارے میدانوں پر قبضہ کر کے ہر جگہ غیر اللہ کی حکومت قائم کرتا ہے اور برابر اس امر کے لیے کوشاں رہتا ہے کہ اسلامی اقدار کا پوری طرح قلع قمع ہو۔ وہ دین کے ایک ایک نقش کو مٹاتا اور اس کے معمولی سے معمولی اثرات کو پوری قوت سے

زائل کرتا ہے۔ اور ان میدانوں میں بھی وہ خاص طور پر بڑی ذہانت کے ساتھ قوت و طاقت کے اصل مراکز کو براد
راست اپنی تحویل میں لیتا ہے تاکہ انسانی زندگی پر اس کا تسلط پوری طرح قائم ہو اور قائم رہے۔

ظاہر بات ہے کہ اسلام کو حیات انسانی کے سارے گوشوں پر حاوی کرنے کے لیے جب بھی جدوجہد کی
جائے گی تو سب سے پہلے اس امر کی کوشش کرنی ہوگی کہ قوت کے اصل مراکز کو طاغوت کے قبضے سے نکال
لیا جائے کیونکہ اگر یہ مراکز اس کے ہاتھ سے نکل جائیں تو پھر اس کا تسلط زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ جماعت
اسلامی کی سیاسی سرگرمیاں، جن کی وجہ سے اُسے ہوس اقتدار اور دنیا پرستی اور دین سے انحراف اور محض ایک
سیاسی جماعت بن کر رہ جانے کے طعنے دیئے جاتے ہیں دراصل اجتماعی اقتدار کے مراکز کو طاغوت کی گرفت
سے نکالنے ہی کی کوششیں ہیں۔ اسلام اگر دین نہ ہوتا بلکہ محض گیان و صیانت یا چند مذہبی رسوم کا مجموعہ یا ایرانی
کیف و سستی کے حصول کا ذریعہ ہوتا تو پھر واقعی اجتماعی معاملات میں کسی مسلمان کی دخل اندازی یا سیاسی
سرگرمیوں میں شرکت گناہ عظیم ہوتی، کیونکہ دنیا داری کے یہ سارے دھندلے مرتبے اور مکاشفے کی راہ میں
حائل ہونے والے ہیں لیکن اس حقیقت کو کس طرح نظر انداز کر دیا جائے کہ خدانے انسان سے بندگی کا مطالبہ
کیا ہے اور بندگی کے لیے یہ شرط ضروری قرار دی ہے کہ اس کی غلامی میں اُسے سے پہلے طاغوت کی غلامی
سے اپنے آپ کو کبیر آزاد کر لیا جائے۔ لہذا ایک شخص کے صحیح معنوں میں مومن و مسلم بننے کے لیے یہ ضروری ہے
کہ اس کی زندگی کے جن حصوں پر بھی طاغوت کا قبضہ ہے ان حصوں کو اس کی گرفت سے نکالا جائے اور پھر
انہیں اسلام کے تابع بنایا جائے تاکہ پوری زندگی بندگی رب کی منظر ہو۔

جماعت اسلامی بلاشبہ سیاسی سرگرمیوں میں شریک ہوتی ہے، مگر اس کے پیش نظر اقتدار کے ہاتھوں کی
تبدیلی یا اپنے کارکنوں کے لیے کرنی دینا داری مراعات یا اونچے مناصب کا حصول نہیں ہے۔ اُس کی شرکت کا
محکم صرف دینی مقصد ہے۔ وہ ان سیاسی کاموں میں اُسی احساس ذمہ داری کے ساتھ حصہ لیتی ہے جس کے
ساتھ نماز اور دوسرے دینی فرائض سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ اسے یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہیں کہ عقیدے

اور زبانی اقرار اور چند مخصوص مذہبی اعمال کی حد تک تو ہم مسلمان ہوں مگر ہماری تعلیم، تہذیب، تمدن، سیاست، معیشت، قانون، نظم و نسق، اور وسائلِ نشر و اشاعت پر شیطان کی حکمرانی قائم رہے۔ جب انسان یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ خدائے واحد کی مخلوق ہے اور اس بنا پر اسی کا تابع ہے تو اس حقیقت کا شعور و احساس رکھتے ہوئے وہ کبھی یہ بات گوارا نہیں کر سکتا کہ قوت و طاقت کے سارے سرچشموں اور اثر و اقتدار کے تمام مراکز کو وہ شیطان کے ہاتھ میں دے دے تاکہ وہ زندگی کے ایک ایک گوشے کو مجرمانہ ذہنیت کے ساتھ کفر و الحاد سے سیراب کرتا رہے۔ اگر مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ قوت و طاقت کے ان سرچشموں کو خدا فراموش لوگوں کے تصرف سے نکال کر ان لوگوں کے تصرف میں دینے کی کوشش نہ کریں جو انہیں اسلام کی سرمنڈی کے لیے استعمال کرنے کا مقدس غم رکھتے ہوں۔ یہ کوشش دنیاداری نہیں بلکہ عین دینداری ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ اس کوشش میں تساہل دینداری نہیں ہے۔

غور کیجئے، آخر جس کام کو یہ لوگ سیاسی کام کہتے ہیں وہ کس اعتبار سے شجر ممنوعہ ہے۔ سیاست دراصل اجتماعی زندگی کی وہ قوتِ قاہرہ ہے جو حیاتِ انسانی کے سارے شعبوں کو جس پنج پر چاہتی ہے وہ حال ہوتی ہے۔ کسی قوم کی سیاسی ہیئت یوں تو شریعت ہی سے اجتماعی زندگی کی تشکیل میں غیر معمولی اہمیت کی حامل رہی ہے لیکن دورِ جدید میں اس کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اور اس کا دائرہ کار غیر معمولی طور پر وسیع ہو گیا ہے۔ سنتی انقلاب سے پہلے سیاست کا میدان قدر سے محدود تھا۔ لیکن اس انقلاب کے بعد جب اجتماعی زندگی کے گوشے دور دراز تک پھیل گئے تو اس اجتماعی ہیئت میں بھی ہمہ گیر طاقت و وسعت پیدا ہو گئی جو ان گوشوں کے درمیان نظم و ضبط پیدا کرنے کی فہم دار ہے۔ اس بنا پر ریاست اور مملکت کی طاقت اور اس کے دائرہ کار میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور سیاسی معاملات کی اثر آفرینی عین ناقابلِ بیان حد تک بڑھ گئی ہے جو فرد یا جماعت اجتماعی قوت و طاقت کے اس مرکز کو نظر انداز کرتی ہے وہ زندگی میں اپنی مرضی کا کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتی بلکہ اپنی مرضی کے خلاف انقلاب کے برپا ہونے کو روک بھی نہیں سکتی۔

آپ زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر دوڑائیں اور دیکھیں کہ آخر یہ کس قوت کے مختلف مظاہر ہیں۔ ملک کا نظام تعلیم خدا کے پرستار اور اسلام کے علمبردار پیدا کرنے کے بجائے خدا کے باغی پیدا کر رہا ہے۔ ملک کا نظام معیشت مخلوق خدا کو راحت اور آرام پہنچانے کے بجائے اس کی زندگی کو عذاب بنا رہا ہے اور جو حرام خوردہ بننا چاہتے ان تک کو حرام خوردہ پر مجبور کر رہا ہے۔ ملک کا نظام معاشرت انسانوں کے مابین محبت اور تعاون کی فضا قائم کرنے کے بجائے نفاق اور دشمنی کے بیج بوری رہا ہے۔ ملک کی انتظامیہ پر ایسے لوگوں کا تسلط ہے جو اس قوم کو کوئی دشمن قوم خیال کرتے ہوئے بڑی سنگدلی کے ساتھ اس پر حکومت کر رہے ہیں۔ ملک میں زبردستی وہ تعاقب لائی جا رہی ہے جو روز بروز بے حیائی اور فسق و فجور کو ترقی دیتی چلی جا رہی ہے اس ساری صورت حال کو دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہماری زندگی کے کسی گوشے میں بھی اسلام کا عمل دخل نہیں رہا ہے بلکہ اس پر غیر اسلامی قوتیں قابض ہیں۔ یہاں قدرتی طور پر انسان کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ جس ملک کی عظیم اکثریت اسلام سے وابستہ ہے اور اسلام کو ایک حکمران قوت دیکھنے کی بھی آرزو مند ہے اس کے ہاں غیر اسلامی افکار و اعمال اور غیر اسلامی نظام حیات پرورش پا رہا ہو؟ اس کا سبب ایک ہی ہے کہ وہ مرکزی قوت جو اجتماعی زندگی کے ان شعبوں کی تشکیل کی ذمہ دار ہے اس پر غیر اسلامی قوتوں کا قبضہ ہے۔ قوت کے اس مرکز کو خدائزس ہاتھوں میں منتقل کرنے کی کوشش کو آخر کس طرح دنیا پرستی کہا جاسکتا ہے؟ اور کیا خدا پرستی کے معنی یہی ہیں کہ دنیا پر خدا سے بغاوت چھاتی پٹی جائے اور آپ بس اللہ اللہ کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں؟

پاکستان کی نہیں بلکہ پورے دنیا کے اسلام بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ پوری انسانیت کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ایک مختصر سی خدا شناس اقلیت نے اس مرکزی قوت پر بالکل ناجائز تسلط قائم کر رکھا ہے جو اجتماعی زندگی کی صورت گری کرتی ہے۔ آپ اخلاقی انحطاط کے اس زلزلے میں بھی انسانوں کے دلی جذبات کا جائزہ لیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انسانوں کی عظیم اکثریت روحانی سکون، قلبی اطمینان، معاشرتی عدل و انصاف اور آزادی کی دل و جان سے متمنی ہے۔ مگر اس آرزو کے باوجود اسے ان میں